پروفیسر ایم۔ ایم شریف
مترجمہ: انوار حسین

اقتصادیات میں انفرادیت کا تصور

قدیم طریقِ فکر کے معاشی مفکرین کے نزدیک ذاتی جلبِ منفعت کی خواہش وہ سرچشمہ ہے کہ جس سے مبادلہ، قیمت، دولت، سرمایہ وغیرہ یک بیک پیدا ہو جاتے ہیں۔ معاشیین جو فلسفۂ لذت (HEDONISM) کے قائل ہیں، انفرادی منفعت کے جذبہ کی تعبیر لذتیت کے نقطۂ نظر سے کرتے ہوئے ذاتی حصولِ لذت کی خواہش کو تمام افعالِ انسانی کا منتہائے مقصود قرار دیتے ہیں۔

لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ کیا نظامِ معیشت کُل کا کُل محض انفرادی منفعت کی خواہش کی پیداوار ہے؟ کیا لذت کہ جسے تمام افعال کا منتہائے مقصود اور تمام خیر و خوبی کی اصل قرار دیا جاتا ہے وہ، اور انفرادی حصولِ لذت، دونوں چیزیں ایک ہیں؟ ہیوم (DAVID HUME) جو دورِ جدید میں فلسفۂ تلذذ کا بانی تھا، اس قسم کی انفرادیت کا قائل نہ تھا۔ اس نے اس خیال کو رد کیا ہے کہ محض حبِ نفس ہی افعالِ انسانی کی اصل ہے۔ اس کے نزدیک ہمدردی کا جذبہ تمام سماجی اور اخلاقی کردار کی بنیاد ہے۔ لیکن آدم اسمتھ کے نزدیک بہر صورت نظامِ معیشت تمام تر انفرادی کردار کے ہم آہنگ ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک ہر فرد منفعت کے لیے کام کرتا ہے اور سوسائٹی جو محض ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے صرف انفرادی افاد کی مظہر ہے۔ اس مفروضہ کی حقیقت پورے طور پر سمجھنے کے لیے آیئے

---

(۱) لفظ انفرادیت (INDIVIDUALISM) مغربی مفکرین نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ہر بڑے مفکر کا اس کے متعلق اپنا ایک تصور ہے اور پھر مختلف علوم کے لحاظ سے جن میں یہ لفظ بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے اس کا مفہوم بدلتا جاتا ہے۔ مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، علم تمدن اور اقتصادیات سب کی اصطلاح انگریزی لفظ INDIVIDUALISM (انفرادیت) ہے۔ مابعد الطبیعیات و اخلاقیات میں ایک طرف فشتے، ہیگل، نٹشے، الیگزنڈر، برگساں وغیرہ اور دوسری طرف لاک، ہابس، بنتھم، مل وغیرہ کے تصورات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں لیکن ان سب نے لفظ INDIVIDUALISM بطور اصطلاح استعمال کیا ہے۔ لیکن معاشیین مثلاً آدم سمتھ، جیونس، رکارڈو وغیرہ نے جس مفہوم میں اسے استعمال کیا ہے اس کی تعبیر ہم "انفرادی حصولِ منفعت کی خواہش" یا پھر اپنی زبان کے عام لفظ "خودغرضی" سے کر سکتے ہیں۔

پہلے اس کی تاریخ پر تھوڑا سا غور کر لیں۔

دورِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے تمام ادوار میں انسان کی فطرت کے متعلق نظریات جو کچھ اور جتنے کچھ بھی ہوں، ان سب کی بنا پر کم از کم اس بات پر اتفاق تھا کہ انسانی خود غرضی کو لازمی طور پر اخلاقی قوانین کے زیر اثر لایا جائے۔ اس کا طریقہ یا مذہبی تھا یا عقلی۔

مذہب کے لیے اہم ترین مسئلہ خدا یا دیوتاؤں سے انسان کا تعلق قائم کرنا تھا۔ انسان کے انسان سے تعلق کا مسئلہ بذاتِ خود کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، محض ثانوی درجہ رکھتا تھا۔ ہر مذہب کے لیے اس دوسرے مسئلہ کا حل پہلے مسئلہ کے حل پر مبنی تھا اور پہلے مسئلہ کا حل کم و بیش یہ تھا:

انسان خدا یا دیوتاؤں کی مخلوق ہے اور اس کی تقدیر آسمانی احکام کی تابع ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے بعض مخصوص انسانی ہستیاں یا بعض اوتار مامور ہیں، جنہیں روحانی حقیقتوں کا براہِ راست علم ہے یا جو ان کی بنا پر قوانین وضع کرتے ہیں۔ ان خارجی قوانین کی پابندی نفسِ انسانی کو خیر کی طرف مائل کرتی ہے اور ان قوانین سے بغاوت، جو کہ شیطان کے بہکانے سے پیدا ہوتی ہے، شر کی طرف لے جاتی ہے۔ شیطان انسان کی خود غرضی کے جذبات و خواہشات کو بھڑکا کر اسے بہکاتا ہے۔ اس لیے انہیں قابو میں لا کر احکامِ خداوندی اور انسانی تعلقات کے تقاضاؤں کا پابند بنانا چاہیے۔ خود غرضی یا ذاتی خواہشات کی اندھا دھند پیروی کی جگہ ہمدردی، محبت، کرم، ضبطِ نفس، اور عدل وہ خوبیاں ہیں کہ جن پر انسانی تعلقات مبنی ہیں۔ اس لیے اخلاقی زندگی کا نشوونما انہیں خوبیوں کے حصول پر منحصر ہے۔ تمام قدیم مذاہب کی اصل تقریباً یہی ہے اور عیسائیت، یہودیت اور اسلام کی بھی۔

فلاسفۂ یونان کا نقطۂ نظر اس سے کچھ بہت مختلف نہ تھا۔ عقلِ انسانی کا حکم، جو اگرچہ الہامی نہیں بلکہ انسان کی عقلی کاوشوں کا نتیجہ ہے، دراصل خدا کا حکم ہے۔ یہی انسان کے لیے فطری قانون ہے۔ اس لیے کہ انسان اصلاً ایک ذی فہم مخلوق ہے۔ لیکن ذی فہم ہونے کے باوجود وہ حیوان بھی ہے۔ عقل و فہم اس کی شخصیت کا اعلیٰ عنصر ہے اور حیوانیت اسفل۔ خود غرضی کی خواہشات اور ہیجانات اسی سفلی عنصر کی پیداوار ہیں۔ اور عقل و ادراک علوی عنصر کی۔ یہی تعقل اخلاقی احکام کی روح ہے۔ خود غرضی افلاطون کے نزدیک تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے اس لیے اسے دور رکھنا چاہیے۔

قرونِ وسطیٰ میں مغرب اور مشرقِ قریب میں لوگوں نے مذہبی عقائد کی عقلی تصدیق چاہی اور

چونکہ اس قسم کی توجیہہ یونانی فلسفہ کے ذریعہ بخوبی ممکن تھی اس لیے قدیم عیسائی راہبوں کی تعلیم اور یونانی فلاسفہ خصوصاً ارسطو کی تعلیم کا اختلاط شروع ہوا۔ مذہب اور فلسفہ کی اس آمیزش نے انسان کے روحانی اور عقلی عنصر کو اس کے حیوانی عنصر سے متمیز کر دیا۔ مقدم الذکر کو اس نے اخلاقی اصول مثلاً محبت، عدل، رحم، کرم اور ضبطِ نفس کی بنیاد قرار دیا۔ اور موخر الذکر کو خود غرضی، نفسانیت اور حرص و طمع کا منبع۔ اس لحاظ سے انسان کی اخروی نجات اور سماج کی ترقی اس کے عقلی عنصر کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ اور ذاتی حصولِ منفعت، حیوانی عنصر کا منتہائے مقصود۔ اس تعلیم کی رو سے مقدم الذکر کا مقصد موخر الذکر کی قربانی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

سولھویں صدی میں اس طرزِ فکر کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ لوگوں نے اپنے آپ کو مذہب کے اثر سے آزاد کرنا شروع کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ کے اثرات سے بھی۔ اگرچہ ابھی تک وہ عقل کے قائل تھے۔ نشأۃ ثانیہ کے دور میں مافوق الطبیعی چیزوں کا اثر طبیعی چیزوں پر اور علوی چیزوں کا اثر سفلی چیزوں پر شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ کلیسا کا اقتدار رفتہ رفتہ سلطنت کے اقتدار کو جگہ دینے لگا۔ اور پھر سلطنت کا اقتدار بتدریج افراد کی خود مختاری میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ تجدید مسیحیت (THE REFORMATION) مغرب کی نشأۃِ ثانیہ (THE EUROPEAN RENAISSANCE) دورِ تجارت (THE AGE OF MERCANTILISM) اور روشن خیالی کا عہد[1] (THE AGE OF ENLIGHTENMENT) ان سب کے اندر یہی روح کارفرما تھی اور بتدریج تقویت حاصل کرتی جا رہی تھی۔ درحقیقت یورپ کی تمام تاریخ جنگِ عظیم کے زمانہ تک اسی تغیر کے مختلف مدارج کی داستان ہے۔[2]

اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذہنی رجحانات میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوئی۔ بجائے مذہبی اور اخلاقی قوانین کی حقیقت میں کاوش کرنے اور یہ دریافت کرنے کے کہ کیا "ہونا چاہیے" اب توجہ قوانین

---

(۱) پندرھویں اور سترھویں صدی کے مابین یورپ کے وہ مختلف ادوار جن میں کلیسا کی حکومت رفتہ رفتہ "قومیت" میں منتقل ہو گئی۔ (مترجم)

(۲) CF. HEROLD J. LASKI. THE RISE OF EUROPEAN LIBERALISM. 1939

فطرت کو دریافت کرنے اور یہ معلوم کرنے کی طرف مائل ہوئی کہ "ہے کیا؟" ان سوالات نے کہ جن کا تعلق تصوری اور فوق الطبیعی مسائل سے تھا اب رفتہ رفتہ ان سوالات کو جگہ دینا شروع کیا کہ جن کا تعلق فطری واقعات سے تھا۔ روحانی قوانین نہیں بلکہ فطری قوانین اب فلسفی، سیاستدان اور ماہر اقتصادیات کے فکر و نظر کی جولانگاہ بن گئے۔ انسان اور خدا کے تعلق کی حیثیت اب محض ذاتی رہ گئی۔

لوتھر (LUTHER) کالون (COLVIN) بودن (BODIN) میکیاولی (MACHIAVELLI) سے ہو کر ہوکر (HOOKER) برونو (BRUNO) بیکن (BACON) ہابس (HOBBES) لاک (LOCKE) کوئزنے (QUESNEY) والٹیر (VOLTAIRE) آدم سمتھ (ADAM SMITH) برک (BURKE) بنتھم (BENTHAM) مل (MILL) بوہم لورک (BOHM BOWERKE) جیونس (JEVONS) یہ سب مظاہر تھے ان قوتوں کے جو سولھویں صدی اور انیسویں صدی کے درمیان دینی اور روحانی میلانات کی جگہ دنیاوی اور فطری زندگی کی طرف رجحان پیدا کر رہی تھیں۔

اس رجحان کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوا کہ انسان کی فطرت کیا ہے۔ قدیم مذہبی تصور کہ انسان کی حقیقت محض روح ہے اور جسم سے اس کا تعلق محض مادی خواہشات کی بنا پر ہے، یا افلاطون کا خیال کہ انسان کی حقیقت وہ نہیں کہ جیسا وہ واقعتاً ہے بلکہ وہ ہے کہ جیسا مسئلۂ اعیان کے مطابق اس کا ذہنی تصور قائم کیا گیا ہے۔ یا اسی قسم کا ارسطو کا عقیدہ کہ انسان کی فطرت وہ نہیں کہ جو کچھ "وہ ہے" بلکہ وہ ہے کہ جو کچھ وہ "بن سکتا ہے۔" وہ نہیں کہ جو کچھ "وہ ہے" بلکہ وہ کہ جو اسے "ہونا چاہیے"۔ یہ تمام عقائد ترک کر دیے گئے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ فطرت کا پیدا کیا ہوا انسان، جیسا کچھ بھی وہ ہے، کیا ہے؟ میکیاولی (MACHIAVELLI) وہ پہلا مفکر تھا جس نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق انسان کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ وہ تصور کہ زمانۂ مابعد میں اقتصادیات کا بنیادی اصول بن گیا۔ اس کے نزدیک انسان بنیادی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے اور خود غرضی کا جذبہ اس کے تمام وجود میں جاری و ساری ہے۔

میکیاولی کی طرح ہابس (HOBBES) نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ ذاتی منفعت کی خواہش ہی انسانی زندگی کا اصل اصول ہے۔ اس کے نزدیک انسان محض ایک منفرد ہستی ہے اور اسے اپنے احساسات کے علاوہ کسی دوسری چیز سے کوئی سروکار نہیں۔ "بے غرض خواہشات" کا کہیں وجود نہیں۔ تمام خواہشات کا دارومدار انسان کے اپنے انفرادی وجود میں کسی قسم کی خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کی

تمنا پر ہے۔ انسان کو فطرتاً خود غرض، بدطینت اور درندہ صفت قرار دیتے ہوئے ہابس نے ایک سخت گیر حکومت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسپینوزا (SPINOZA) نے اگرچہ بالکل مختلف مفروضات سے ابتدا کی تھی اور اگرچہ اس نے ایک بالکل مختلف سیاسی نظریہ قائم کیا لیکن اس کا نقطۂ نظر بالکل "انفرادی یا" ذاتیاتی" تھا۔ اس کے اس مفروضہ نے کہ انسانی فطرت اصلاً بقاءِ نفس پر مبنی ہے، اسے فرد کو سلطنت کے قبضہ سے آزاد کر دینے کا موقع دیا۔ بیکن (BACON) نے بھی ذاتی مفاد کی خواہش کو تمام انسانی افعال کا محرک قرار دیا ہے۔ یہی انفرادیت تھی کہ جس نے لاک (LOCKE) کو جمہوریت کی تعلیم دینے پر مائل کیا۔ المختصر، انفرادیت کا اصول آدم اسمتھ (ADAM SMITH) کے زمانہ تک کہ جسے بجا طور پر اقتصادیات کا بانی کہا جا سکتا ہے، مغربی طریق فکر میں تقریباً تمام اصول کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ خود آدم اسمتھ نے شخصی اغراض کے علاوہ دوسرے محرکات خصوصاً جذبۂ ہمدردی کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ اس لیے نفسیات کے نقطۂ نظر سے اسے قطعیت کے ساتھ انفرادیت پسند کہنا بالکل صحیح نہ ہوگا۔ لیکن بہر حال اس نے انفرادیت کی تعلیم دی ہے۔ اس لیے کہ اس کی رائے میں محرکات کا فطری توازن کچھ ایسا ہے کہ ذاتی اغراض اور جذبۂ ہمدردی دونوں ہمیشہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ فرد کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر ایک ایسے مقصد کے حصول میں معاون ہوتا ہے کہ جو اس کے مدرک ارادہ کا کوئی جزو نہیں ہوتا۔ دوسروں کا مفاد ہمیشہ اس کے اپنے فائدہ میں مضمر ہوتا ہے۔

اگرچہ حرص و طمع اور خود غرضی اب نسبتاً ایک بے ضرر لفظ "شخصی مقاصد" کے پردہ میں چھپا کر انسانی فطرت کا اصل اصول قرار دیدیے گئے، لیکن زبانی ہی سہی، تھوڑا بہت لحاظ عقل کا بھی کر ہی لیا جاتا ہے۔ انسان فطرتاً ذاتی خواہش کا تابع ہے۔ لیکن ہابس اور اس کے بعد کے مفکرین کی رائے میں ذاتی اغراض کی یہ پیروی کورانہ طور پر نہیں بلکہ روشن خیالی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ انسان کو ذاتی اغراض کی پابندی محض ظاہری طور پر نہیں بلکہ واقعی طور پر کرنا چاہیے۔ محض اپنی حماقت سے کسی چیز کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہوئے نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اور اس کا فائدہ دریافت کرنے کے بعد۔ اب یہ قرار پایا کہ ذہن کو پورا یقین ہونا چاہیے کہ فرد جس چیز کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے وہ درحقیقت مفید ہے بھی کہ نہیں۔ عقل و علم

---

(۱) حوالہ کے لیے دیکھیے آدم اسمتھ کی کتاب: AN INQUIRY INTO THE NATURE AND CAUSES OF THE WEALTH OF NATIONS (1925) VOL. II, P. 206

کو اب خود غرضی کی راہنمائی کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ عقل و فہم کا استعمال اور ہوش مندی کی ضرورت ہے تو اس لیے کہ ذاتی منفعت کہیں خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس چیز کو فرد خود اپنے لیے مفید سمجھتا ہے وہ (خدانخواستہ) دوسروں کے لیے فائدہ بخش ثابت ہو۔ عقل اب خود غرضی کے جذبات کی مالک نہیں اب وہ ان کی غلام ہے۔ اس کی حیثیت اب حرم سرا کی اس لونڈی کی سی ہے کہ جس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی مالکہ کو چراغ کی روشنی میں اس کے خلوت کدہ تک پہنچا دے کہ جہاں پہنچ کر وہ دل کھول کر دادِ عیش دے سکے۔ روشنی دکھانا تو ہر حال ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ (خدانخواستہ) وہ بھول کر عبادت خانہ میں، یا اپنی بیمار ماں، بہن یا بھائی کے کمرے میں پہنچ جائے۔ خود غرضی بہت قوی جذبہ ہے۔ مشکل ہی سے کبھی وہ غلط (یعنی غیروں کے لیے مفید) راستہ پر پڑ سکتا ہے۔ لیکن کیا عجب کہ ایسی غلطی کبھی سرزد ہو ہی جائے، اس لیے اس کی ہدایت اشد ضروری ہے۔ افلاطون کے زمانہ کا بادشاہ (عقل)، اب آدم سمتھ کے زمانہ میں ایک ادنیٰ غلام ہے اور اس کے زمانہ کا غلام (ہوس) تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے:

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا!

یہ 'انفرادیت' یا 'ذاتیت' جدید طرزِ فکر کی تجربیت سے پیدا ہوئی اور ایک اہم اصول بن گئی[1]۔ آدم سمتھ نے اسے اپنے معاشی نظریات کی بنیاد قرار دیا۔ یہی ذاتیت جے۔ ایس۔ مِل (J. S. MILL) باسٹیٹ (BASTIAT) اور نو کلاسیکی طرزِ فکر نے اختیار کی۔ ان سب کے نزدیک انفرادیت زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ان مفکرین کے نزدیک ذاتی اغراض کے آگے اور کچھ نہیں۔ اگرچہ ایک منطقی مغالطہ کے ذریعہ مِل ذاتی اغراض اور دوسروں کی اغراض دونوں کو ایک کر دکھاتا ہے۔

یہ کہنا کہ ہم ذاتی اغراض کے علاوہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرتے، نفسیاتی انفرادیت ہے۔ اور یہ سمجھنا کہ ہمیں ذاتی اغراض کے علاوہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرنا چاہیے، اخلاقی انفرادیت ہے۔ معاشیین ان دونوں کا خلط مبحث کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔ کہتے تو وہ یہی ہیں کہ انہیں نفسیاتی

---

(۱) اس اصول کی مفصل کیفیت کے لیے دیکھیے: HEROLD J. LASKI کی کتاب "THE RISE OF EUROPEAN LIBERALISM"

ذاتیت سے ہی تعلق ہے۔ اس لیے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہی اقتصادی طریق کار ہے لیکن غیر شعوری طور پر وہ اخلاق کے دائرہ میں پہنچ کر یہ درس دیتے نظر آتے ہیں کہ "روشن خیال خود غرضی" تمام اقتصادی اعمال کا مقصد ہونا چاہیے۔

ہم سب سے پہلے نفسیاتی انفرادیت کا مطالعہ کریں گے جو معاشیین کے اپنے دعویٰ کے مطابق اقتصادیات کا بنیادی اصول ہے۔ اس کے بعد ہم اخلاقی انفرادیت سے بحث کریں گے جسے وہ لوگ بآسانی نظر انداز کر سکتے ہیں جن کے نزدیک ان کا علم (اقتصادیات) اخلاقی طرزِ فکر سے بالکل بے تعلق ہے۔

انفرادیئن یہ تو نہیں فرض کرتے کہ ذاتی مقاصد کے علاوہ اور کسی دوسرے قسم کے محرکات کا وجود نہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی افعال اکثر محبت، مروّت، دوستی، رحمدلی، حتیٰ کہ ایثار تک کے ذریعہ رو پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے تمام بظاہر بے غرض محرکات کی تہہ میں درحقیقت خود غرضی کی تحریک کارفرما ہے۔ جیسا کہ بنتھم (BENTHAM) نے کہا ہے کہ "ان محرکات کی تہہ میں دراصل خود غرضی ہے کہ جس نے 'کرم' کا جامہ پہن رکھا ہے۔" لوگ دوسروں کی خوشی اس لیے چاہتے ہیں کہ اس میں دراصل ان کی اپنی خوشی مضمر ہے۔ وہ نیکی اس لیے کرتے ہیں کہ نیکی کرنا خود ان کیلیے لذت بخش ہے۔ انفرادیت یا ذاتیت قدرت کا قانون ہے اور انسان قدرت کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اسی قانون کا تابع ہے۔

ربطی نفسیات[1] (ASSOCIANIST PSYCHOLOGY) کی تشریح کے مطابق کرم ابتداءً ذاتی حصولِ لذت کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لیکن ذاتی لذت سے مربوط ہو جانے کے بعد پھر مقصود بالذات سمجھا جانے لگتا ہے۔ لیکن ہمیں نفسیات کے اس نظریہ کی تردید پر زیادہ وقت نہیں صرف کرنا چاہیے کہ آج شاید ہی کوئی اس کا قائل ہو۔

لیکن یہ دعویٰ کہ ذاتی منفعت تمام افعال کی اصل ہے، اقتصادیات میں انفرادی طریقِ فکر کی

---

(۱) علم النفس کے ابتدائی دور کا وہ نظریہ کہ جس کی رو سے تمام خیالات اور افعال ایک دوسرے سے خارجی طور پر مربوط و متصل ہیں اور یہ رابطہ نفسِ حقیقت سے کوئی لازمی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اتفاقی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نفسیات کی کوئی تاریخ۔ (مترجم)

بنیاد ہے ۔ چنانچہ ہمیں اسی سے بحث ہے ۔ یہ کہنا کہ ذاتی اغراض یا شخصی حصولِ لذت ہمیشہ ہمیشہ مقصود ہوتا ہے ایسا ہی نفسیاتی دعویٰ ہے کہ جیسا کہ یہ کہ لذت ہی ہے کہ جس کی ہمیشہ خواہش کی جاتی ہے ۔ اور چونکہ اس دوسرے دعویٰ کی تردید ہو چکی ہے لہٰذا پہلا دعویٰ خود بخود رد ہو جاتا ہے ۔

خود غرضی یا ذاتیت ، افادیت کی ضد ہے ۔ افادیت کا مدعا یہ ہے کہ خود غرضی کو ترک کرکے فرد ، تمام اغراض و مقاصد کو دوسرے یا دوسروں کی بھلائی کے لیے تمامتر وقف کر دے ۔ ذاتیت کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کے ایثار کے ذریعہ بھی فرد صرف ذاتی تسکین چاہتا ہے ۔ اس دعویٰ میں کچھ صداقت بھی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں اور جانوروں کے افعال بیشتر ذاتی ہوتے ہیں ۔ اس سے بھی ہمیں انکار نہیں کہ بڑے ہو کر بھی لوگوں کی بعض ذاتی خواہشات بہت قوی ہوتی ہیں جو صرف ان کے اپنے مفاد کی تابع ہوتی ہیں اور جو دوسروں کے مفاد کے خلاف بھی ثابت ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً تحفظِ نفس اور بقاءِ ذات کی خواہش ، دوسروں پر تفوق اور برتری حاصل کرنے کی خواہش ، دوسروں پر حکومت حاصل کرنے کی خواہش وغیرہ ۔ ذاتی کامیابی کی خواہش انسان کی بہت اہم خواہشات میں سے ہے ، اور ہاپ (HOPPE) ولف (WOLFF) اور ڈمب (DUMBE) کے تجربات کے ذریعہ کافکا (KOFFEKA) اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ " تمام کرداری مجموعوں میں کوئی طاقت ہے جو نفس کو بلندی کی طرف ابھارتی ہے " اور اسے زیادہ سے زیادہ بلند درجہ پر پہنچنے کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے[1] ۔

علاوہ ازیں اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان کو اس قسم کے افادی افعال سے ، مثلاً اپنی زندگی کو جواں مردی کے کارناموں کی خاطر خطرہ میں ڈالنا ، یا خاندان کی کفالت کرنا ، یا اپنے ذاتی لذائذ ، اپنی صحت اور اپنی دولت کو دوستوں کی خاطر قربان کر دینا ، ایک قسم کی ذاتی تسکین حاصل ہوتی ہے ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انسان کو اس قسم کے افعال ترک کر دینے سے زیادہ تکلیف ہوتی بہ نسبت ان کو انجام دینے کے ۔

---

(۱) حوالہ کے لیے دیکھیے کافکا کی کتاب : PRINCIPLES OF GESTALT PSYCHOLOGY ص ۴۰۷
نفسیات کے اس طرزِ فکر کے بموجب نفس ، چیزوں کا ادراک انفرادی طور پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر کرتا ہے اور یہی ایک صورت ہے کہ جس میں نفس انسانی حرکت میں آسکتا ہے ۔ (مترجم)

مگر اول تو یہ تسلیم کرنے کے کہ انفرادی میلانات انسان میں فطرتاً موجود ہیں، یہ معنی نہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے میلانات کا وجود نہیں۔ ثانیاً یہ بات کہ بے غرضی کے افعال بھی ذاتی تسکین بہم پہنچاتے ہیں، یہ تسلیم کر لینے کے مرادف نہیں کہ وہ کیے ہی جاتے ہیں ذاتی تسکین کے لیے۔

آیئے پہلے مابعد الذکر پر غور کریں۔ ذاتی تسکین کسی افادی فعل کی تکمیل کی خصوصیت ہے، اس فعل کا مقصد نہیں۔ کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان افعال کا مطمح نظر یا منتہائے مقصود ہے افادی افعال میں ذاتی تسکین قطعاً اتفاقی طور پر ضمناً حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ارادہ کا کوئی مخصوص جزو نہیں۔ کسی شخص کا ذہنی مطمح نظر ان حالات میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کے مقصد کی پیروی ذاتی تسکین کے لیے کر رہا ہے بلکہ برخلاف اس کے اس کا مقصد دوسروں کے لیے سکون کا سامان بہم پہنچانا ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے ذریعہ اسے ذاتی تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر مقصد کی تکمیل کے وقت ذاتی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ افادی افعال اس لیے انجام دیئے جاتے ہیں کہ ذاتی تسکین حاصل ہو۔ وہ تسکین کہ جو ہم افادی افعال کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اس لیے حاصل ہوتی ہے کہ ہم اصولاً ایک ایسے مقصد کے حصول کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں جو ابتدا ہی سے ہمارا ذاتی مقصد نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی خاطر ہمیں مقصود ہوتا ہے۔

ہم نے دو سوال اٹھائے تھے۔ مابعد الذکر پر غور کر چکنے کے بعد اب ہم اول الذکر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ افراد نہایت قوی ذاتی اغراض رکھتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے علاوہ ان کی کوئی اور اغراض نہیں ہوتے۔ اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ غیر ذاتی اغراض اس حد تک بنیادی نہیں جتنی کہ ذاتی اغراض۔ درحقیقت ہم ایک قدم اور آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ انسان کی فطرت سے نسبتاً زیادہ گہرا تعلق رکھتی ہیں، کیونکہ وہ "جماعت" کی قوتوں سے متعلق ہیں، اور فرد جماعت کا محض ایک جزو ہے۔ یہ کہنا کہ فرد محض ذاتی خواہشات رکھتا ہے ایک لاطائل، دقیانوسی نفسیات کا نظریہ ہے اس لیے اپنے دعاوی کی تائید میں جو اس قسم کی نفسیات کے خلاف ہیں ہم دوبارہ نفسیات کے جدید نظریات کی طرف رجوع کریں گے۔

کرداری نفسیات(۱) (BEHAVIOURISTIC PSYCHOLOGY) انسانی اور حیوانی

---

(۱) ڈاکٹر واٹسن (WATSON) کا طریق تشریح جو "BEHAVIOURISM" کہلاتا ہے تمام (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

افعال کے زیادہ بنیادی مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہے اور ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی کہ جہاں وہ زیادہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوئی مفید کوشش کر سکے۔ علاوہ ازیں، اس کے عجیب و غریب طریقے اور اس کی مخصوص اصطلاحات اس قسم کے مسئلہ کے حل کرنے کے لیے کچھ زیادہ موزوں بھی نہیں کہ جو اس وقت زیر بحث ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے تو مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ غیر ذاتی میلانات حیوانی فطرت کے قدرتی اجزا ہیں۔ اگر کسی ذی حیات جسم کے کردار کی کسی خاص ماحول میں ردِ عمل کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ جو جسم ذی حیات کے بقاء و قیام کے لیے مفید اور ضروری ہیں تو اس قسم کے رد عمل کی بعض ایسی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں کہ جو دوسرے اجسام ذی حیات کے قیام و بقا میں معاون ہیں۔ دوسرے ذی حیات اجسام اگرچہ خود ماحول کا جزو ہوتے ہیں لیکن ان سے مخصوص طور پر اس قسم کے کردار کا تعلق ہوتا ہے۔ اس قسم کا ردِ عمل مثلاً مرغی کا کتے پر اپنے بچوں کو بچانے کے لیے حملہ، اس قسم کے کردار کی مثال ہے۔ جیمس (JAMES) جو تفاعلی نفسیات[1] (FUNCTIONAL PSYCHOLOGY) کا بانی ہے کہتا ہے کہ نوعی ہمدردی کے تہیجات اور ذاتی محرکات یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں تک معلوم ہے نفسیاتی حیثیت سے ایک ہی سطح پر پر پیدا ہوتے ہیں۔[2]

تجزیاتی نفسیات[3] (PSYCHO ANALYSIS) کی زبان میں اگر ایک طرف ھد (ID) یعنی وہ غیر شعوری اندرونی نفس ہے جس کی خواہشات و ہیجانات نفسِ شعوری کی طرف ذاتی حصولِ لذت کی خواہشات کی شکل میں عود کر آتے ہیں تو دوسری طرف نفسِ فوق الشعور بھی ہے، جو معیار،

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) نفسیاتی افعال کی تشریح انسان کے ظاہری کردار کی بنا پر کرتا ہے۔ واٹسن کے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے کہ جس سے ہم نفسیاتی مطالعہ کو خارجی حیثیت سے قابلِ اعتبار سمجھ سکتے ہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھیے واٹسن کی تصنیف یا نفسیات کی کوئی جدید تاریخ۔ (مترجم)

(١) نفسیات کا یہ نظریہ کہ مختلف قسم کے احوال جسم و دماغ کی مخصوص ترکیب کی بنا پر مخصوص طور پر مختلف قسم کے ماحول میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھیے جیمس کی کتاب۔ اصولِ نفسیات۔ WILLIAM JAMES - PRINCIPLES OF PSYCHOLOGY

(٢) فرائڈ (FREAD) کا مشہور نفسیاتی نظریہ کہ جو نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کی بنیادی جنسی خواہش پر رکھتا ہے۔ (مترجم)

نصب العین اور مطمحِ نظر کا مقام ہے کہ جس کا کام نفس کی نگرانی کرنا اور اپنے معیار کے مطابق اس کے بے جا استیلاء کو روکنا اور قابو میں لانا ہے۔ نفسِ شعوری غیر شعوری طور پر فوق الشعور کا تابع ہے۔ اگر نفس داخلی یا مطالعۂ باطن میں محور رہنے والی نفسیاتی کیفیت کا وجود ہے تو نفس خارجی یا بیرونی دنیا اور سوسائٹی میں محور رکھنے والے رجحانات بھی موجود ہیں اور پھر تداخلی یعنی دوسری شخصیتوں کو اپنے اندر جذب کر کے نفس کو ان سے متحد کر دینے والے رجحان کا وجود بھی ہے[1]۔ اگر نارسسیت (NARCIS-SISM) یا ارتکازِ نفسی یا خود پسندی ہے تو دیگر پسندی یا نفس کا اتحاد ان مطمحائے نظر سے کہ جن کا محور دوسروں کی ذات ہے؟ بھی موجود ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جد و جہد بھی۔

مقصدی نفسیات[2] (PURPOSIVIST SCHOOL OF PSY.) کا مقتدا میکڈوگل (MAC-DOUGALL) اور مشاہداتی نفسیات کا رکن عظیم ٹچنر (TITHNER) دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ افادی میلانات اور ذاتیاتی میلانات دونوں انسان اور حیوان کے فطری محرکات ہیں اگر ہم ان کے تسمیہ[3] اور "ترتیب[4]" کے فرق کو نظر انداز کر دیں تو وہ دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اگر استیلاء اور تحفظِ نفس کے مہیجات موجود ہیں تو خود فراموشی اور نوعی ہمدردی اور "توالد" یا "جذبۂ خاندانی" جیسے مہیجات کا بھی وجود ہے۔

ان ماہرینِ نفسیات میں سے کہ جو ان متذکرۂ بالا طرز ہائے فکر میں سے کسی کے پابند نہیں، ہم صرف تین کا ذکر کریں گے۔ وب (WEBB) ایولنگ (AVELING) اور بارٹلٹ (BARTLET)۔

---

(۱) فرائڈ کی زبان سے اب ہماری اردو بھی نابلد نہیں رہی۔ اس نے نفسِ انسانی کی تقسیم متذکرہ بالا طور پر کی ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے PSYCHO-ANALYSIS کی کوئی کتاب یا WOODWORTH کی CONTEMPORARY SCHOOLS OF PSYCHOLOGY

(۲) نفسیات کا وہ اسکول کہ جس کے لحاظ سے ہمارے تمام محرکات جو پیدائش کے وقت سے موت کے وقت تک مختلف اعمال و افعال پر ہمیں مجبور کرتے ہیں، دراصل مختلف مقاصد کی تکمیل کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ بسا اوقات ہمیں ان مقاصد کا ادراک و احساس نہیں ہوتا مگر اندرونی طور پر وہ ہمارے جسم و دماغ کی ساخت و ترکیب کا جزو ہونے کے باعث خود بخود کام کرتے رہتے ہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھیے میکڈوگل کی تصنیف یا ووڈ ورتھ کی متذکرہ بالا کتاب (مترجم) (۳) نفسیات وہ طرق تجزیہ جو نفس کا مشاہدہ اندرونی طور پر کرتا ہے۔ (۴) دیکھیے INDUCTIVE LOGIC کی کسی کتاب میں CLASSIFICATION اور NOMENCLATURE۔

وہ تجربات جو جب سنے پروفیسر اسپیرمین (SPEARMAN) کے دار التجربہ میں کیے ہیں "ارادہ" کا کچھ اس قسم کا تصور پیدا کرتے ہیں، جیساکہ تجزیاتی نفسیات کے "فوق الشعور" کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ذاتی محرکات (یعنی اس قسم کے محرکات مثلاً استیلار خود رائی، شخصی ارادہ، عدم رواداری، شخصی حکومت۔ خودپسندی، خراج تحسین وصول کرنے کی خواہش، خود فریبی، نمود و نمائش، خود اعتمادی، غرور، مفاخرت، احساسِ برتری، عزِ نفس، نخوت، تکبر، دوسروں کی تحقیر، تحکم پسندی، غلبہ حاصل کرنے کی خواہش وغیرہ وغیرہ) کے علاوہ ایک غالب قوتِ ارادی بھی ہے جو ان سب پر حاکم ہے اور جس کی قوت افادی میلانات سے بعینہٖ مطابقت رکھتی ہے (مثلاً رحم کا اصول یا ہمدردی کا جذبہ، تعاون کی روح، مذہبی رابطہ سے خلوص اور اس کی افادی اہمیت) ایولنگ کے نتائج انسان کی فطرت کے متعلق بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں[1]۔

بارٹلٹ کا خیال ہے کہ تین بنیادی رجحانات ہیں کہ جن سے تمام سماجی رشتے قائم ہوتے ہیں۔ غلبہ، اطاعت اور انسان کے دورِ طفولیت کی ہ روحِ تعاون۔ ہمارے نزدیک اطاعت غیر متعلق ہے، غلبہ انفرادی ہے، اور تعاون قطعاً افادی اور اجتماعی ہے۔

مختلف نفسیاتی طرز ہائے فکر کی یہ تحقیق ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہونی چاہیے کہ افادی حیثیت بھی انسان کے لیے اتنی ہی اساسی ہے کہ جتنی ذاتیت۔

لیکن صرف محرکات اور ان کا ردِ عمل اور جبلتی خصوصیات ہی انسانی کردار کی مکمل توضیح کے لیے کافی نہیں۔ فرد ایک سماجی اور خارجی ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور یہ ماحول اس کی تعمیر کا کوئی غیر اہم جزو نہیں۔ وہ صرف ماحول سے ردِ عمل ہی نہیں کرتا بلکہ خود اس سے متاثر ہوتا ہے۔

گسٹالٹ (GESTALT PSY.) طریقِ فکر کی نفسیات نے بالخصوص اس چیز پر زور دیا ہے[2]۔ کافکا کہتا ہے کہ فرد تمام مخفی رجحاناتِ فطری کا تجربہ اس جماعت کے جبلی رجحانات کے مطابق کرتا ہے۔

---

(۱) حوالہ کے لیے دیکھیے SPEARMAN CHARLES کی تصنیف "FEELINGS AND EMOTIONS"
WITTENBERY SYMOPIUM P. 46

(۲) اس کی توضیح کے لیے دیکھیے KOFFEKA کی کتاب
PRINCIPLES OF GESTALT PSYCHOLOGY PP. 658-666

کہ جس کا وہ ایک فرد ہے۔ اور اس تجربہ میں جماعت میں فرد کی حیثیت اور مرتبہ کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے "عمل کا سرچشمہ نظامِ نفسی کے تناؤں سے پھوٹتا ہے" اور "اس کی حرکت و رفتار کا دارومدار ماحول کے رقبۂ کل (TOTAL FIELD) کی مجموعی قوتوں کے باہم جذب و تاثر پر ہوتا ہے۔" مثلاً قائد قیادت اس لیے کرتا ہے کہ علاوہ اس کے ذاتی جذبۂ استیلاء اور افادی جذبۂ تعاون کے، ایسے لوگ موجود ہیں کہ جو اس کی پیروی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اور مقتدی، مقتدی اس لیے ہیں کہ علاوہ جذبہ ہائے تعاون اور اطاعت کے ایک قائد ہے کہ جس کی وہ اقتدا کر سکیں۔ قائد اور مقتدی دونوں کے کردار باہم مربوط اور ایک دوسرے پر مبنی ہیں۔ اور ان قوتوں کے ربط و اشتراک کا نتیجہ ہیں کہ جن سے رقبۂ کردار (BEHAVIOURAL FIELD) مرتب ہوتا ہے۔ ذاتی حیثیت سے فرد محض ایک ذہنی تجرید ہے۔ پورے نظامِ اجتماعی سے علاحدہ اس کی کوئی ہستی نہیں۔ چونکہ وہ 'کل' کا 'جزو' ہے اس لیے اس کے افعال بڑی حد تک 'کل' سے مرتب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مخفی رجحاناتِ فطری کے دراصل اجتماعی رجحانات ہیں کہ جو فرد کو ان افعال پر مجبور کرتے ہیں جو اس سے صادر ہوتے ہیں۔ خود اس کی فطرت ایک عملِ مربوط کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک سماجی نظام کا۔ اور اس کی ترقی اور تکمیل کا دارومدار اسی عمل پر ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کافکا نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے "میں" بحیثیت "ہم" کے ایک جزو ہونے کے اپنی فطرت کے لحاظ سے "ہم" کی اس قسم پر مبنی ہے کہ جس کا وہ ایک جزو ہے۔ اور اس مرتبہ اور حیثیت پر، کہ جو اسے "ہم" کے نظام کے تحت حاصل ہے۔"[1]

میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ کوئی منظم جماعت اپنے کسی جزو کی ترکیب ایسی نہ کرے گی جو خود جماعت کے مقاصد کی تکمیل کے حق میں رکاوٹ ثابت ہو۔ اور جب کبھی اس قسم کی رکاوٹیں یعنی ایسے افراد پیدا ہوں گے کہ صرف ذاتیاتی میلانات رکھتے ہوں تو ان کا شمار امراض میں کیا جائے گا۔ ایسے لوگ یا تو قید کر لیے جاتے ہیں یا جسم (جماعت) سے نوچ کر پھینک دیے جاتے ہیں۔ افادی رجحانات ذاتیاتی رجحانات کی طرح کہ جن سے کردار مرتب ہوتا ہے، فرد میں جماعت کے نظامِ کلی کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ جس کی خصوصیت وہ چیز ہے کہ جسے تہذیب کہتے ہیں اور جس کے اجزا فیشن، رسم ورواج، طور طریقے، آرٹ، سائنس، مذہب وغیرہ ہیں۔

---

(۱) حوالہ کے لیے دیکھیے کافکا کی کتاب: PRINCIPLES OF GESTALT PSYCHOLOGY P676

ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نفسیاتی دعویٰ کہ تمام اعمال کا منتہائے مقصود محض فرد کی ذاتی خواہشات ہیں، نفسیاتی حیثیت سے غلط ہے۔

اچھا۔ ایک ذہنی غلط مبحث کی بنا پر جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، افادی مفکرین نہایت خاموشی سے اس نفسیاتی دعوئے سے "کہ ذاتی اغراض کے علاوہ اور کوئی اغراض موجود نہیں ہیں" ایک بالکل مختلف دعوئے پر پہنچ جاتے ہیں کہ اعمال کا منتہا سوائے فرد کی ذاتی اغراض کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے" اور یہ ایک ایسا دعوئے ہے جو (علم النفوس سے نہیں بلکہ) علم الاخلاق سے متعلق ہے۔ اس لیے انکارِ دعوئے صرف یہی نہیں کہ حظ نفس ہی وہ چیز ہے کہ جس کی خواہش "کی جا سکتی ہے۔" بلکہ یہی ایک چیز ہے کہ جس کی خواہش "کرنا چاہیے"۔ یا بالفاظِ دیگر یہی "خیر محض" ہے کہ جو وجود رکھتی ہے۔ اس خیال کی بہترین تعبیر ٹامس ہابس نے کی ہے اور اس میں انتہائی تضاد ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ تمام تر خوبی لذت ہی میں ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ لذت میں خوبی ہے، خواہ وہ میری لذت ہو یا آپ کی یا زید کی۔ لیکن جب میں یہ کہوں کہ "تمام تر خیر و خوبی کی اصل میرا ذاتی تلذذ ہے" تو اس کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ لذائذ پر میرا ذاتی قبضہ تمام تر خیر و خوبی کی اصل ہے۔ لیکن میں اگر اس کے ساتھ یہ بھی کہوں کہ کسی دوسرے کا قبضہ و تسلط لذائذ پر، یہ بھی تمام تر خیر و خوبی کی اصل ہے، تو ظاہر ہے کہ میرے طریقِ فکر میں تضاد واقع ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مور (G. E. MOORE) کے "ذاتیت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر شخص کا تلذذ کمالِ خیر و خوبی ہے۔ یعنی یہ کہ بہت سی چیزیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ان میں سے ہر ایک وہ چیز ہے کہ جس کے علاوہ خیر و خوبی کا کہیں وجود نہیں۔ تضاد کی انتہا ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر اس نظریہ کی تردید اور کیا ہو سکتی ہے؟"(۱)

گاڈون، بنتھم، دونوں مِل اور زمانہ مابعد کے افادئین بہر صورت اس سادہ لوح انفرادیت کے قائل نہیں۔ وہ اسے ایک قسم کی افادیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس دعوئے سے کہ "ہر شخص ذاتی مفاد کی خواہش کرتا ہے اور یہی اسے کرنا چاہیے۔" وہ اس دعوے پر پہنچ جاتے ہیں کہ "ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ افراد کے مفاد کی خواہش کر سکتا ہے اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے"۔ بنتھم اس نتیجہ پر اس دلیل کے ذریعہ پہنچا ہے کہ "خود غرضی خود بخود کرم کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اس استدلال سے

---

(۱) حوالہ کے لیے دیکھیے: G. E. MOORE کی کتاب PRINCIPIA ETHICA

توہم پہلے بحث کر کے اسے رد کر چکے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مِل صاحب یہ معجزہ کس طرح صادر فرماتے ہیں۔ مِل اپنی کتاب "افادیت" میں ذیل کی دلیل پیش کرتا ہے۔ " کوئی وجہ نہیں بتائی جاسکتی کہ مفادِ عامہ کی خواہش کیوں کی جاتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ ہر شخص اپنی ذاتی خوشی چاہتا ہے۔ ہر شخص کی خوشی اس کے اپنے فائدہ کے لیے ہے۔ اس لیے عمومی خوشی بحیثیت مجموعی تمام افراد کے لیے مفید ہے۔" افادیت کا واحد ثبوت یا انفرادی لذتیت سے اجتماعی فلسفۂ لذت تک پہنچنے کے لیے واحد دلیل جو اس عظیم الشان منطقی نے دریافت کی ہے وہ منطقی مغالطۂ اجتماع (FALLACY OF COMPOSITION) پر مبنی ہے۔ جیسا کہ جیمس مارٹینو (JAMES MARTINEAU) نے کہا ہے کہ " ہر شخص (کی کاوش) اپنی ذات واحد کے لیے " اور ہر شخص (کی جدوجہد) تمام اشخاص کے لیے، ان دونوں کے درمیان (استدلال کا) کوئی راستہ نہیں (جو پہلے سے دوسرے تک پہنچا سکے)۔

انفرادیت یا ذاتیت مغربی لبرلزم کی بنیاد ہے اس لیے تمام لبرل معاشیین کا مسلّمہ ہے حقیقت یہ ہے کہ سوائے اجتماعیین، اشتراکیین اور ایک خاص حد تک کیمبرج اسکول کے افادی معاشئین (CAMBRIDGE WELFARE SCHOOL) کے چند ہی معاشئین ایسے ہیں کہ جو اس تمام تر بے بنیاد دعوے کے اثرات سے آزاد ہو چکے ہوں۔

قرآن اور علم جدید

مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ علومِ جدیدہ اور قرآن کے درمیان کیا رشتہ ہے، اسلام کی نظر میں علوم کی اہمیت کیا ہے اور وہ ہمارے روزمرہ کے مسائل و مشکلات کو کس طرح حل کرتا ہے۔

قیمت ۴/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور